اقبال اور شعرِ اقبال

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے؟

سچی بات ہے، میں آج تک اس کا صحیح تعین نہیں کر پایا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں خیال تھا کہ آیندہ آنے والی نسلیں بھی شاید انھیں شاعر تسلیم نہ کریں۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو فلسفیوں میں بھی شمار نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کی فکر میں کسی مبسوط فلسفیانہ نظام کا وجود نہیں۔ وہ دینی موضوعات یا دینی فلسفے کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے لیکن عالمِ دین ہونے کا دعویٰ کبھی نہ کیا۔ اگر ان سے کبھی پوچھا گیا کہ شعر و شاعری سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ تو فرمایا کہ میرے چند مخصوص خیالات ہیں جو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں اور انھیں لوگوں تک پہنچانے کی خاطر میں نے شاعری کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

کیا تھے وہ خیالات جو اقبال لوگوں تک پہنچانے کے درپے تھے اور اس قدر جلدی میں تھے کہ عقلی دلائل کو بالاے طاق رکھ کر قلب پر فوری طور پر اثرانداز ہونے والے اشعار کا ذریعہ اختیار کیا؟ اردو میں شعر تو اقبال بچپن ہی سے کہتے تھے، مگر پہلی تصنیف اسرارِ خودی فارسی میں شائع کی۔ کیوں؟ غالباً اس لیے کہ وہ اپنے بقول چاہتے تھے کہ ان کی بات صرف ایک محدود حلقے تک پہنچے مگر فکرِ اقبال تک رسائی کے لیے اس تصنیف سے آشنائی ازبس ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسرارِ خودی میں پھر انھی خیالات (یا انقلابی پیغام) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت سے کسی ہم دم کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ اقبال صاحبِ فکر تھے۔ انھیں کسی صاحبِ عمل کی تلاش تھی، مگر لہجہ رازدارانہ تھا:

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دلِ او روے خویش
سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم او را شوم ہم آزرش

دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسرارِ خودی کے ذریعے اقبال نے کم از کم برِّعظیم کے مسلمانوں کو توحیدِ وجودی کی ظلمات سے نکال کر توحیدِ اسلامی کے روزِ روشن میں لا کھڑا کیا۔ صوفیوں اور سجادہ نشینوں نے بڑا اُودھم مچایا، واویلا کیا اور ہنگامہ بپا کیا۔ ان میں سے بیشتر اقبال کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ توحیدِ وجودی اور توحیدِ اسلامی میں امتیاز پر بحث مدتوں جاری رہی مگر اقبال نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے:

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو اپنی راہ پہ قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دراصل تمدنِ اسلامی کی اقدار کے احیا کے ذریعے ایک نئے مسلم فرد اور نئے مسلم معاشرے کو وجود میں لانے کی پیغمبرانہ دعوت تھی۔ اسی دعوت کے نتیجے میں برِّعظیم کے جمہورِ مسلمین یا ہجومِ مومنین میں رفتہ رفتہ ملّی شعور پیدا ہوا اور جب وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے تو ایک صاحبِ عمل ہم دمِ اقبال (یعنی قائدِاعظم محمد علی جناح) کی زیرِ قیادت ایک منظّم قوم میں منتقل ہو چکے تھے۔ اسی صاحبِ عمل کے ہاتھوں برِّعظیم میں اسلام کو علاقائی شناخت نصیب ہوئی۔ جب اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں ایک علاحدہ مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا تو بعض یار لوگوں نے پھبتی کسی تھی کہ خطبہ کیا دیا، غزل پڑھ ڈالی ہے۔ ذرا غور کیجیے، تاریخِ عالم میں نئی قومیں یا نئی ریاستیں تو سیاسی مدّبروں کے ہاتھوں وجود میں آتی ہیں۔ کیا کوئی ایسی مثال بھی موجود ہے جہاں کوئی شاعر کسی نئی قوم یا نئے ملک کو منصۂ شہود میں لانے کا سبب بنا ہو؟ یہی اردو زبان کے اس شاعر یا شاعر نما کا کمال ہے، لیکن اردو زبان بھی مستحقِ داد ہے کہ اس نے فکر و شعرِ اقبال کا بھاری بوجھ اٹھا کر دبستانِ اردو میں انھیں سنگِ مرمر کی ایک نئی عمارت تعمیر کرنے میں مدد دی۔

اقبال پر اعتراض کیا گیا کہ وہ انسانیت کے نہیں بلکہ صرف مسلم فرقے کے شاعر ہیں۔ اس پر سر تیج بہادر سپرو نے جواب دیا کہ اگر کالی داس شکنتلا لکھے تو اسے کوئی ہندو فرقے کا شاعر نہیں کہتا۔ اسی طرح ملٹن فردوسِ گم گشتہ تحریر کرے تو اسے کوئی مسیحی مذہب کا شاعر قرار نہیں دیتا۔ اگر اقبال کی شاعری روحِ اسلامی کو زمانۂ حال کی روشنی میں ظاہر کرنے کی کوشش ہے تو اس پر تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تہمت کیوں لگائی جاتی ہے؟

قطعِ نظر ایسے سب اعتراضات کے اقبال اپنے آپ کو اسلامی شاعر سمجھتے تھے جیسے کہ اسرارِ

خودی کی آخری نظم 'عرضِ حال مصنف بحضور رحمتہ اللعالمینﷺ' میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر میرے اشعار کے کسی بھی حرف میں قرآن کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے تو روزِ قیامت مجھے رسوا کیجیے اور اپنے بوسۂ پا سے محروم رکھیے لیکن اگر میں نے اپنے اشعار میں قرآن ہی کے موتی پروئے ہیں اور مسلمانوں سے حق بات کہی ہے تو میرے لیے خدائے عزّوجلّ کے روبرو عرض کیجیے کہ میرا عشق، عمل سے بغل گیر ہو جائے۔

اقبال اور شعرِ اقبال کی اسلامیت اور راست فکری کے بارے میں برِّعظیم کے بعض مستند علمائے کرام کی آرا پر نگاہ رکھنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی قرآن مجید کی سورۃ شعرا (۲۶: آیات ۲۲۴ تا ۲۲۷) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ شاعر معتوب ہیں جو عشق بازی، شراب نوشی یا آوارگی کے مضامین بیان کریں، بازاری عورتوں یا کسی کی بہو بیٹی کے حسن کو موضوعِ سخن بنا کر پیش کریں۔ بقول ان کے یہ وہ دہریے اور مادہ پرست شاعر ہیں جو اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جسمانی لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کی مخلوق، جنھیں احساس نہیں کہ دنیا میں انسان کے لیے کوئی بلندتر مقصد ہو سکتا ہے مگر جن شاعروں کو ان سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ چار خصوصیات کے حامل ہیں: پہلی یہ کہ مومن ہوں۔ دوسری یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔ تیسری یہ کہ ذاتی طور پر اور اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کو اکثر یاد کرنے والے ہوں اور چوتھی یہ کہ ذاتی غرض کے لیے کسی کی ہجو نہ کریں۔ نسلی یا قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ نہ بھڑکائیں، مگر ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پڑے تو زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد شمشیر سے لیتا ہے۔[1]

کیا اقبال کا شمار ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جن میں یہ چار خصوصیتیں موجود ہوں؟ مولانا مودودی کے ہاں اس سوال کا جواب تو نہیں ملتا، البتہ اقبال کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان میں کچھ فرقۂ ملامتیہ کے سے میلانات تھے، جن کی بنا پر اپنی رندی کا اشتہار دینے میں انھیں کچھ مزہ آتا تھا ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاصا شغف تھا، نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں۔[2]

مولانا حسین احمد مدنی سے اقبال کا مناظرہ ہوا تھا۔ بعدازاں صلح صفائی ہو جانے کے باوجود نہ تو عمر بھر مولانا نے انھیں بخشا اور نہ اقبال نے مولانا کو معاف کیا۔ اقبال کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنی کی رائے ہمیشہ یہی رہی کہ اقبال اپنی ساری زندگی غلط فہمیوں کا شکار رہے اور ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا۔ یعنی انگریز کے اشاروں پر ناچتے ناچتے تمام عمر گزار دی۔ (متحدہ قومیت اور اسلام، ص: ۹)[3]

اقبال کے متعلق مجلسِ احرار کے قائد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا فیصلہ تھا کہ اقبال کا قلم تو تمام عمر صحیح رہا لیکن قدم اکثر و بیشتر غلط۔[۱۳]

مولانا نجم الدین اصلاحی ارشاد کرتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں کیوں کہ ہم نے ان کے کلام کو بغور پڑھا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ مرحوم کے جہاں سیکڑوں اور ہزاروں اشعار مفید ہیں، وہیں ان کے کتنے اشعار ایسے ہیں جن میں کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفے پر ان کی زد پڑتی ہے۔ پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکرِ اقبال کی روشنی میں تو ہوسکتا ہے کیوں کہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے، وہ مرحوم ہی کے فلسفے کا دوسرا نام ہے[۱۴] یعنی صحیح اسلام کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔

انگریزی نثر میں اقبال کی تصنیف یعنی خطبات کے بارے میں چند برس ہوئے ریاض (سعودی عرب) میں کسی سیمی نار میں ایک مصری عالم کی تحریک پر قرار دیا گیا کہ اقبال کی یہ کتاب کفریات پر مبنی ہے۔ اس لیے مسلمان اسے پڑھنے سے گریز کریں۔ اقبال کی اس تصنیف کے متعلق مولانا سیّد سلیمان ندوی کی ابتدا ہی سے یہ رائے تھی کہ یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو بہتر تھا۔ شاید اسی بنا پر ان خطبات کا اردو ترجمہ خاصی مدت کے بعد شائع ہوا۔

اسی متنازعہ تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے نقشِ اقبال کے مصنف مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں کہ وہ اقبال کو نہ تو معصوم سمجھتے ہیں نہ متقی و پرہیزگار، نہ رہبرِ دین نہ امامِ مجتہد۔ نہ ان کی فکری کاوشوں کی تعریف میں، ان کے مداحین کی طرح، حد سے گزر جانا انھیں قبول ہے۔ ان کی رائے میں حکیم سنائیؔ، عطاؔر اور عارفِ رومیؔ احترام و اتباعِ شریعت، ہم آہنگیِ فکر و عمل، اور یگانگتِ قول و فعل میں اقبال سے بہت آگے تھے۔ اقبال کے ہاں اسلام اور فکرِ اسلامی کی بعض ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن کے ساتھ اتفاق کرنا بڑا مشکل ہے۔ اقبال کے بعض نوجوان حامیوں کی طرح وہ اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ اقبال سے بہتر اسلام کو کوئی نہیں سمجھ سکا یا یہ کہ اسلامی علوم اور تاریخی حقائق کے متعلق جو معلومات اقبال کو حاصل ہیں وہ کسی اور کو حاصل نہیں، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تمام عمر اقبال اپنی ہم عصر عالم شخصیتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسی خامیاں تھیں جن کی تطبیق ان کے علم کی وسعت اور پیغام کی عظمت کے ساتھ نہیں ہوتی۔ بدقسمتی سے انھیں اپنی ان خامیوں سے نجات حاصل کر سکنے کا موقع نہ ملا۔ ان کے خطباتِ مدراس میں کئی ایسے خیالات و نظریات پیش کیے گئے ہیں جو اہلِ سنت والجماعت کے کئی اعتقادات سے متصادم ہیں۔

اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے آپ نے غور کیا ہوگا کہ اقبال بقول خود نہ شاعر تھے، نہ فلسفی، نہ عالمِ دین۔ لیکن اگر وہ اپنے طور پر یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ انسانیت کے نہ سہی، اسلام کے شاعر تو ہیں تو خطبات یعنی تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کی اشاعت کے بعد ان کی مسلمانی کو بھی متنازعہ

بنا دیا گیا۔ اقبال کو بخوبی احساس تھا کہ برِّعظیم کے نہ صرف عامی مسلمان بلکہ بعض علماے کرام بھی وسعتِ نظر سے عاری اور قدامت پسند ہیں، لہٰذا وہ نئے نظریات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ پس متنازعہ خطبات پیران کہن کے لیے تحریر نہیں کیے گئے تھے جن سے اقبال مایوس تھے بلکہ آنے والی نسلوں کی امانت تھے:

من کہ نو میدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن
برجواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اسی صورتِ حال کے سبب اقبال کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آج کے نہیں بلکہ آنے والے کل کے شاعر ہیں:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نواے شاعرِ فرداستم

اب ہم اس پہلو کی طرف آتے ہیں کہ اگر اقبال بقول خود اسلامی شاعر تھے تو شاعری کے بارے میں ان کا اپنا مطمحِ نظر کیا تھا؟ یعنی ان کی اپنی رائے میں شاعری کا معیار کیا نہیں اور کیا ہونا چاہیے؟ اقبال کے خیال میں مسلمانانِ برِّعظیم کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ تھا۔ اس لیے انھیں کسی نئے ادبی نصب العین کی تلاش تھی۔ فرماتے ہیں کہ:

آرٹ میں جو کچھ خوب ہے، ضروری نہیں کہ وہ زندگی میں خوب سے مشابہت رکھتا ہو۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور حیف ہے اس شاعر پر جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھائے۔ اس کی ذمے داری تو یہ ہے کہ فطرت کی لازوال دولتوں میں حیات وقوت کا جو حصہ اسے ودیعت کیا گیا ہے، اس میں اوروں کو بھی شریک کرے، نہ کہ اٹھائی گیرا بن کر جو رہی سہی پونجی اس کے پاس ہے، اس کو بھی ہتھیا لے۔[۱۲]

اقبال آرٹ کو حیاتِ انسانی کے تابع قرار دیتے ہیں۔ اس لیے شاعری کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی صلاحیت کتنی ہے۔ ایسی شاعری جو اس صلاحیت سے محروم ہو، اقبال کے نزدیک حیات کش ہے۔ ان کی راے میں تمام انسانی عمل کا منتہاے نظر شوکت، قوت اور جوش و خروش سے بھری زندگی کی تحصیل ہے۔ پس ارفع شاعری وہی ہے جو انسان کی خوابیدہ قوتِ عزم کو بیدار کرے اور اسے زندگی کی آزمایشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ترغیب دے، لیکن وہ سب کچھ جس کے اثر سے وہ اونگھنے لگے اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں اس کے گرد و پیش موجود ہیں، جن پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے، ان سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔

اقبال کی شاعری ہمیشہ ان کے اپنے بیان کردہ اسی نصب العین کی پابند رہی بلکہ ایک مقام پر اس

کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا

شعر وفکرِ اقبال کی اب تک تر وتازگی کا باعث کیا ہے؟ میری دانست میں صرف پاکستان کے قیام سے ان کے خواب کی تکمیل نہیں ہوئی۔ وہ تمدّنِ اسلامی کی احیا کے شاعر تھے اور جب تک اس احیا کی تکمیل ان کے واضح کردہ اصولوں کے مطابق نہیں ہوتی، ان کے افکار کی شگفتگی ہمیں اپنی طرف کھینچتی رہے گی۔ مختصراً جو بات سمجھنے کی ہے وہ اقبال کے ان افکار کی تفہیم نو ہے جو تشکیلِ جدید الہٰیاتِ اسلامیہ کا موضوع ہیں اور جنھیں علماے کرام نے اپنی قدامت پسندی اور تنگ نظری کے سبب اور جدید تعلیم سے آراستہ نام نہاد روشن خیال طبقے نے اسلامی تمدن کی تاریخ سے اپنی لاعلمی یا ناواقفیت کے سبب آج تک ہاتھ نہیں لگایا۔ معلوم ہوتا ہے روحِ اقبال تقاضا کر رہی ہے کہ بطور شاعر اقبال کا پیچھا اب چھوڑ دیا جائے اور جو حقائق ان کی نثر میں پوشیدہ ہیں، انھیں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اقبال کی اس تصنیف اور دیگر نثری کاوشوں میں کیا کیا وضاحت طلب باتیں ہیں؟ ان کی تفصیل میں جانے کے لیے ایک علاحدہ مقالے کی ضرورت ہے۔ فی الحال یہی کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ان خطبات کی روشنی میں نہ صرف پاکستان بلکہ عالمِ اسلام اور عالم شرق عہدِ کہن سے نکل کر بآسانی دنیاے جدید میں داخل ہو سکتے ہیں، مگر یہ کام کون انجام دے گا؟ وہی افراد جو زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور ایسے نئے معیار دریافت کر سکتے ہوں، جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنے کے قابل ہو جائیں کہ ہمارے گرد ونواح کی حیثیت دائمی نہیں بلکہ انھیں بدلا بھی جا سکتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

کسی قوم کی تقدیر کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اسے کسی نہ کسی اصول کے تحت مستقل طور پر منظّم رکھا جائے بلکہ اس بات پر ہے کہ قوم کس قسم کی لائق اور جرأت مند انفرادی شخصیتیں پیدا کر سکنے کی اہل ہے۔ ایک

ایسے معاشرے میں جہاں محض تنظیم ہی پر زور دیا جائے، فرد کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے معاشرتی فکر کی دولت تو حاصل کر لیتا ہے، مگر وہ اپنی ذاتی اجتہادی روح گنوا بیٹھتا ہے۔ پس اپنی گزشتہ تاریخ کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیا کسی قوم کے زوال کو نہیں روک سکتے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ ایسے نظریات جنھیں کسی قوم نے خود متروک قرار دیا ہو، اس قوم میں کبھی قوت حاصل نہیں کر سکتے۔ کسی قوم کے زوال کو روکنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے، وہ آزاد، نڈر اور خودشناس افراد کی پیدایش، پرورش اور حوصلہ افزائی ہے۔

اردو زبان یقیناً ایسے ہی بے باک شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کی منتظر ہے۔

(یہ مضمون بین الاقوامی اردو کانفرنس اسلام آباد منعقدہ ۹ تا ۱۳ مارچ ۲۰۰۵ء میں پیش کیا گیا)

☆☆☆

حواشی

۱۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، سوم- ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۹۱ء، ص، ۵۴۶-۵۵۰۔

۲۔ ایضاً: رسالہ جوہر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۳۸ء، ص، ۳۹۔

۳۔ حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام- مکتبہ محمودیہ لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۹۰

۴۔ صابر کلوروی، یادِ اقبال مکتبہ شاہکار لاہور، ۱۹۷۷ء، ص، ۵۷۔

۵۔ مکتوباتِ شیخ الاسلام، سوم ۱۹۶۶ء، ص، ۱۴۱۔

۶۔ علامہ اقبال: Speeches, Writings and Statements of Iqbal، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۵ء، ص، ۱۵۸۔

☆☆☆